سیدہ ،س، بخاری

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

جیسے کچھ چیزیں، کچھ لوگ اور کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جو ایک دم بہت بھلے اور بہت اچھے لگتے ہیں، اسی طرح کچھ الفاظ بھی ایسے ہوتے ہیں جنہیں پڑھنے، سننے اور بولنے سے ان کی لطافت، ٹھنڈک اور صوتی تاثیر یک بیک روح میں اتر جاتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں، مجھے بچپن ہی سے "ماموں" کا لفظ بہت بھلا لگتا ہے۔ شاید اس لیے کہ جن حرفوں سے "ماں" کا لفظ بنتا ہے انہی سے یہ لفظ بھی بنتا ہے۔ مجھے یاد ہے، بچپن میں جب میں امی یا آپا کے ساتھ سونے کیلئے لیٹتی تو وہ ایک لوری سنایا کرتی تھیں۔ جس کے آخر میں یہ آتا..... "پیالی گئی ٹوٹ، چاند اماموں گئے روٹھ"..... دو تین مرتبہ سنانے کے بعد، جب وہ یہ کہتیں..... بس اب جلدی سے سو جاؤ ورنہ چندا ماموں روٹھ جائینگے..... تو میں جھٹ آنکھیں موند لیتی، کیوں کہ مجھے چندا ماموں کی ناراضی قطعی گوارا نہ ہوتی۔

کتنی عجیب بات ہے کہ میں، جس نے معصومیت اور نا سمجھی کی عمر میں چندا ماموں کو ناراض نہیں ہونے دیا، شعور اور عقل کی عمر میں ایسا نہ کر سکی۔ میرے چندا ماموں مجھ سے ہمیشہ کیلئے روٹھ گئے۔ جی ہاں میرے ماموں سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمتہ اللہ علیہ علمی دنیا کے ماہتاب ہی تو تھے، جن کی تحریر اور تقریر نے ہمیشہ لوگوں کے سینوں کو ایمان اور یقین سے معمور اور علم و معرفت سے منور ہی نہیں کیا بلکہ ان میں مدوجزر کی سی کیفیت بھی پیدا کی۔ وہ عمر بھر لوگوں کا رُخ مجاز سے حقیقت کی طرف موڑتے رہے، اپنے علم و کردار کی روشنی سے جہالت و ضلالت کی وادیوں میں بھٹکے ہوؤں کو راہِ ہدایت دکھاتے اور راہِ حق کا نشان بتلاتے رہے۔

وہ اجلے کردار، اجلے لباس، مخصوص من موہنی وضع قطع، نرالے انداز اور منفرد لب و لہجہ والی شخصیت جسے ہم سب بھائی بہن "بڑے ماموں جی" کے نام سے پکارتے تھے، مجھے بہت یاد آتی ہے، آنسو رلاتی ہے اور بڑا بے قرار کر جاتی ہے۔ ماموں جی کے حوالے سے کتنی بار چاہا کہ اپنی یادوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کروں لیکن ہر مرتبہ اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کا احساس دامن گیر ہوا اور میں نے سوچا، میں علم کے اس کوہِ گراں کے بارے میں کیا لکھوں اور کیسے لکھوں؟ وہ جسے زیر زبر کی کمی بیشی، تلفظ کی غلطی، جملوں کی نا موزونیت اور بے ربطی بڑی ناگوار گزرتی، اس کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ماموں جی کی یادوں اور باتوں کے مہکے چمن زار کا کونسا پھول پہلے توڑوں، اس کہکشاں کے کس تارے کا انتخاب کروں اور اس روشن اور کھلی کتاب کے کس باب کو پہلے پڑھوں۔ مجھے امی جان کا جملہ یاد آ گیا، انہوں نے اپنے ابا جی رحمتہ اللہ علیہ پر مضمون لکھا تو اس کے شروع میں لکھا کہ "محبت نحوی اور صرفی تراکیب سے آزاد ہوتی ہے مجھے جو جہاں یاد آئے گا لکھتی جاؤنگی"۔ اس جملے نے میری بھی مدد کی اور میرا بھی حوصلہ بڑھایا۔

اس بات میں قطعاً کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد خاندان کی جتنی شخصیات کو بھی دیکھا، ذہناً خود کو سب سے زیادہ ماموں جی کے قریب پایا۔ اور اس قرب کی بڑی وجہ ان کی شخصیت کا علمی ہالہ تھا۔ وہ اپنے مرتبے اور مقام کے اعتبار سے گھر بھر کی محترم شخصیت تھے۔ لیکن ہم ان سے خاصے بے تکلف تھے۔ چونکہ بچپن اور اس کے بعد کے چند سالوں کا بہت سا حصہ ننھیال میں گزرا ہے، اس لیے ان سے وابستہ بہت سی یادیں، بہت سے حوالے اور بہت سے مناظر ذہن میں یوں محفوظ ہیں، جیسے بند مٹھی میں جگنو۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب ہم میں سے کوئی نماز پڑھتا اور ماموں جی دیکھ لیتے تو ہنستے ہوئے کہتے..... بھئی یہ تم نماز پڑھ رہے ہو یا اس کے عدد نکال رہے ہو..... پھر آرام سے سمجھاتے کہ نماز ایسے نہیں پڑھتے۔ اب کوئی نماز ایسی نہیں ہے جسے ادا کرتے ہوئے ان کا یہ جملہ یاد نہ آتا ہو۔

ان کی بیماری کے آخری چند برسوں کے علاوہ، میں نے تو بچپن سے ہی یہ دیکھا کہ جماعتی اور تبلیغی مصروفیات کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت گھر سے باہر گزرتا۔ ماموں جی کا یہ معمول تھا کہ جب بھی سفر پر روانہ ہوتے تو سب سے آخر میں اماں جی کے پاس آتے اور سلام کر کے ان کی بے پناہ دعاؤں میں رخصت ہوتے۔ اور پھر جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے انہی کو ملتے۔ سلام و دعا کے بعد پاس بیٹھ جاتے، اپنے سارے سفر کا حال سناتے، ایک ایک بات بتاتے اور ہم سب بڑے چھوٹے ان کی باتیں دلچسپی سے سنتے حالانکہ بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے بالا ہوتیں، پھر بھی جی چاہتا کہ ماموں جی یونہی باتیں سناتے رہیں اور ہم سنتے رہیں، ماموں جی کو اپنے والدین سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اور ان کا یہ معمول اس کا عملی ثبوت تھا۔

گھر میں قیام کے دوران بھی ان کا زیادہ وقت بیٹھک میں اپنی جماعتی اور تصنیفی مصروفیات اور دوست احباب میں گزرتا۔ لیکن ان سب مصروفیات کے باوجود، جتنا بھی وقت گھر میں گزارتے بڑے بھرپور طریقے سے۔ سب کے ساتھ بات چیت، حال احوال اور خوش طبعی ہوتی۔ بارہا ایسا ہوتا کہ میں انہیں کوئی بات سناتی تو تھوڑی سی سننے کہ بعد کہتے کہ بھئی اتنی روانی سے بولتی ہو، تھوڑا سا وقفہ ہی کر لو۔ میں کہتی..... ماموں جی، کیا فائدہ؟ اتنی دیر میں تو بات ختم بھی ہو جائے گی۔ تو وہ بے اختیار ہنس دیتے۔ ایک عرصہ امی جان کا یہ معمول رہا کہ جمعہ کی چھٹی ہم اماں جی کے ہاں جا کر گزارتے۔ ماموں جی اگر گھر پر ہوتے تو بیٹھک کا گلی والا دروازہ کھلا ہوتا۔ ان کے پاس کئی آدمی بیٹھے ہوتے۔ وہ ہمیں گزرتا دیکھ لیتے اور پھر تھوڑی دیر میں مسکراتے ہوئے اندر آتے اور کہتے..... مہاجرین آ گئے ہیں؟ پھر اپنے مخصوص انداز سے سر کو سینے سے لگاتے ہوئے ہم سب کو پیار کرتے۔

ماموں جی کھانے کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ بالخصوص کشمیری کھانے اور سبز چائے انہیں بہت پسند تھی۔ گھر میں ہوتے تو فرمائش کر کے کچھ نہ کچھ پکواتے رہتے۔ اچھا پک جانے پر بہت تعریف کرتے۔ کئی کھانوں کی ترکیب میں اپنی طرف سے اضافہ بھی کرتے۔ ان کی تجویز کردہ ترکیب کے مطابق بنائے گئے شامی کباب جنہوں نے کھائے ہیں، وہ اب بھی یاد کرتے ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود مجھے ایک بات آج

بھی یاد ہے، جس سے ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو سامنے آتا ہے۔ ایک مرتبہ وہ سفر سے واپس آئے تو صبح ناشتے کے وقت پسی ہوئی کالی مرچ اور نمک کی ضرورت پڑی۔ اتفاقاً گھر میں اس وقت موجود نہ تھی۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میرا سفری بکس کھولو، اس میں کالی مرچ نمک کی ایک ڈبیہ پڑی ہے وہ اٹھا لاؤ۔ میں اٹھا تو لائی لیکن حیران بہت ہوئی کہ ماموں جی کے بکس میں اس کا کیا کام؟ اور شاید میری یہ حیرت بھی وہ بھانپ گئے۔ کہنے لگے کہ یہ میں اس لیے ساتھ رکھتا ہوں کہ سفر کے دوران دور افتادہ گاؤں اور قصبوں میں جانا پڑتا ہے اور بعض اوقات میزبان ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ جو غریب محض ہوتے ہیں، تو میں انہیں کسی بھی تکلیف سے بچانے کیلئے کہتا ہوں کہ بس سادہ روٹی مکھن سے چپڑ کر لے آؤ، اور اس پر یہ نمک مرچ چھڑک کر کھا لیتا ہوں اور وہ میری اس فرمائش سے ہی خوش ہو جاتے ہیں۔

وہ باتیں جو ہم نے بڑی عمر میں کتابوں میں یا اساتذہ سے پڑھی اور سمجھیں، ماموں جی نے بچپن ہی میں بتا اور سمجھا دیں تھیں۔ مثلاً حدیث کی تعلیم کے دوران پڑھا کہ عید الفطر والے دن نماز عید سے پہلے کچھ کھانا سنت ہے۔ لیکن میری علم میں یہ بات ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی تھی کیوں کہ یہ ماموں جی کا معمول تھا کہ وہ عید الفطر کی نماز کے لیے جانے سے پہلے ایک دو کھجوریں کھاتے اور ساتھ یہ بتاتے کہ ایسا کرنا سنت ہے، اور عید الاضحیٰ والے دن قربانی کے جانور ذبح ہونے کے بعد ناخن تراشتے اور حجامت درست کرتے۔ اسی طرح حدیث میں ہے کہ نماز عید کے لیے جانے اور آنے میں راستہ تبدیل کرنا سنت ہے۔ انہوں نے یہ سنت یوں نبھائی کہ ہمیشہ واپسی پر نانا ابا جی کی قبر سے ہوتے ہوئے آتے۔ گویا وہ ان خوشی کے لمحات میں بھی اپنے باپ کی یاد سے غافل نہ ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سی ایسی خصوصیات اور نعمتوں سے نوازا تھا جو صاحب نصیب لوگوں کے ہی حصہ میں آتی ہیں۔ ان میں سے ایک نعمت قرآن کی محبت اور اس کی کثرت سے تلاوت ہے۔ تلاوت کا جو معمول عام دنوں میں ہوتا وہ رمضان میں کئی گنا بڑھ جاتا۔ جب تک صحت نے ساتھ دیا، ان کا یہ معمول رہا کہ روزہ افطار کرنے کے بعد نماز مغرب ادا کرتے اور اپنے وظائف میں کافی دیر مشغول رہتے، کھانا کھاتے، پھر آرام کی غرض سے لیٹ جاتے۔ پھر یوں ہوتا کہ جب سب افراد نماز عشاء و تراویح سے فارغ ہونے کے بعد سونے لگتے تو وہ اٹھ جاتے۔ گرمیوں کے موسم میں، گھر کے صحن میں ایک طرف بنے ہوئے چھوٹے سے چبوترے پر نماز عشاء اور تراویح میں مشغول ہو جاتے۔ اس کے بعد کے لمحات کا لفظوں میں احاطہ کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے تو اتنا یاد ہے کہ پھر رات کے جس پہر بھی آنکھ کھلتی، رات کے سناٹے میں ماموں جی کی سوز میں ڈوبی ہوئی آواز سماعتوں سے ٹکراتی اور قلب و روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی۔ جی چاہتا یہ لمحے امر ہو جائیں، وہ یوں ہی قرآن پڑھتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ لیکن یہ سلسلہ سحر تک چلتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم لوگ سحری کھاتے، ماموں جی اس وقت بھی تلاوت میں مصروف ہوتے اور پھر جب وقت سحر کے ختم ہونے میں دس پندرہ منٹ باقی ہوتے تو وہ نماز وتر اور اس کے بعد طویل دعا سے فارغ ہوتے۔ اس دوران اماں جی دو تین بار آواز دیتیں..... حافظ جی! جلدی کر لیں وقت ختم ہونے والا ہے۔ لیکن یوں لگتا کہ حافظ جی کی طبیعت قرآن

پڑھتے پڑھتے سیر نہیں ہوتی۔ پھر آخری چند منٹوں میں "سٹینڈرڈ بیکری" سے منگوایا ہوا ایک بن کھا کر اور نمکین لسی کے دو تین گلاس پی کروہ سحری کرتے۔ اسی معمول کے ساتھ وہ سارے رمضان میں ہر رات تقریباً نو دس پارے تراویح میں پڑھتے اور دن میں ہر نماز میں قرآن کی تلاوت کا معمول الگ سے جاری رہتا۔ سوچتی ہوں کہ ماموں جی کی شفاعت اور بخشش کیلیے چبوترے کی ان اینٹوں کی گواہی بھی کافی ہے، جن پر کھڑے ہو کر انہوں نے سال ہا سال، شب بھر قرآن پڑھا ہے۔

میرے ماموں کا زندگی گزارنے کا اپنا ہی ایک انداز تھا۔ سادگی اور بے نیازی کا امتزاج، اور اس سلسلے میں میں نے انہیں کسی سے مرعوب ہوتے نہیں دیکھا۔ ان کا معیار دنیا نہیں دین تھا۔ دینی اور علمی شخصیات کی بے پناہ قدر کرتے بلکہ ہمیں بھی ان کے واقعات اور باتیں سناتے اور اکثر اوقات آبدیدہ ہو جاتے۔ بالخصوص علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمتہ اللہ علیہ کا جب بھی ذکر کرتے خود بھی روتے اور ہمیں بھی رلاتے۔ ماموں جی کو علم سے پیار نہیں عشق تھا۔ باوجود یکہ اللہ نے انہیں یہ دولت اتنی فراوانی سے عطاء کی تھی کہ جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ میں نے ان کی طلب میں کبھی کمی نہیں دیکھی۔ ہر لحہ جستجو، ہر پل کھوج اور ہر گھڑی تحقیق و تفحص میں مصروف رہنا چاہتے۔ میں انہیں دیکھتی تو یہ حدیث یاد آجاتی

منھو مان لا یشبعان منھوم فی العلم لا یشبع منہ و منھوم فی الدنیا لایشبع منہا
(دو حریص کبھی سیر نہیں ہوتے۔ علم کا حریص، علم سے اور دنیا کا حریص دنیا سے)

اور میرے ماموں واقعی منہم فی العلم تھے۔ وہ دوسروں کی علمی مشغولیت سے بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم تینوں بہنوں کو جامعہ خیر المدارس کے شعبہ تعلیم النساء سے علم دین حاصل کرنے کی سعادت نصیب فرمائی تو ماموں جی اس پر بہت خوش تھے۔ بارہا امی جان سے کہا کہ تم خوش نصیب ہو، تمہاری اولاد دین کی طرف لگی ہوئی ہے۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی، اکثر پوچھتے، آج کل کیا پڑھ رہی ہو؟ کون کون اساتذہ پڑھاتے ہیں؟ ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ جن دنوں میں نے پرائیویٹ طور پر پی ٹی سی کیا، انہی دنوں ان سے ملاقات ہوئی۔ حسب عادت پوچھا، آج کل کیا مصروفیت ہے؟ اب میں جواب دینے سے تھوڑی سے جھجکی کہ کہیں ماموں جی یہ نہ کہہ دیں کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن جب میں نے بتایا تو ان کا جواب میری توقع کے خلاف تھا۔ کہنے لگے اچھی بات ہے، کوئی نہ کوئی شغل ہونا چاہیے۔ گویا ان کے نزدیک علمی مصروفیت بہت بڑی چیز تھی۔ خواہ وہ دنیاوی علم کی ہو یا دینی کی۔

ان کی زندگی میں ہمیں کوئی بھی مسئلہ پیش آتا، خواہ وہ لغت کا ہوتا یا گرامر کا، ذہن میں ایک ہی بات آتی کہ کون کتابیں کھنگالے، ماموں جی سے ملنے جائیں گے تو پوچھ لیں گے، اور وہ سوال پورا ہونے سے پہلے ہی مسئلہ حل کر دیتے۔ ایک مرتبہ دوران تعلیم میری ہم درس لڑکیوں میں اس بات پر بحث ہوئی کہ "امام اعظم" کہنا درست ہے یا نہیں؟ مجھ سمیت کسی کو بھی اس کے بارے میں صحیح علم نہ تھا۔ اتفاقاً دو تین دن کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا، اور میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہنے لگے........ بالکل صحیح ہے۔ یہاں امامت سے مراد ان کی بزرگی ہے۔ ماموں ہمارے لیے ایک مضبوط حوالہ اور ایک سند

کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس لفظ یا بات کی وہ اصلاح کر دیتے، اس کے بارے میں کسی کی تصدیق کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ وہ غلط چیز کبھی بھی برداشت نہ کرتے۔ وہ کوئی کام ہوتا یا کوئی بات یا کوئی غلط جملہ ہوتا یا لفظ..... کانوں میں پڑتے ہی بے قرار سے ہو جاتے اور فوراً اس کی اصلاح کرتے۔ ایک مرتبہ مجھ سے بڑی ہمشیر نے گفتگو کے دوران لفظ "نماز" (نون مکسور کے ساتھ) کہا تو فوراً ٹوکا اور پھر تفصیل سے بتانے لگے کہ صحیح لفظ "نماز" (نون مفتوح کے ساتھ) ہے۔ اور یہ فارسی کا لفظ ہے۔ فارسی میں نم آنسو کو کہتے ہیں اور آز سے مراد حرص اور طمع ہے۔ انہی دو لفظوں کا یہ مجموعہ ہے..... یہ ان کی عادت تھی کہ ایک جملے یا لفظ کی اصلاح کرتے ہوئے اس سے متعلق جتنی بھی باتیں ان کے علم میں ہوتیں وہ بتاتے اور یوں بتاتے کہ کسی قسم کی تشنگی باقی نہ رہتی۔ کبھی کبھی موڈ ہوتا تو کوئی بات پوچھ کر ہمارا تھوڑا سا امتحان بھی لے لیتے۔ وفات والے سال، ایک دن ہم سب ملنے گئے تو باتوں کے دوران نماز مغرب کا وقت ہو گیا اور وہ نماز کے لیئے تیمم کرنے لگے ایک دم مجھ سے کہنے لگے..... تم آج کل "ہدایہ" پڑھتی ہو، بتاؤ تو بھلا تیمم کی نیت کیا ہے؟ مجھے چونکہ آتی نہیں تھی، میں نے کہا کہ زبان سے کہنا ضروری نہیں، دل میں ارادہ کرنے سے تیمم ہو جاتا ہے۔ زبان سے نیت تو مستحب ہے، کہنے لگے..... بہت سمجھدار ہو (یہ ان کا مخصوص جملہ ہوتا تھا)۔ یہ ٹھیک ہے کہ مستحب ہے، وہی بتا دو۔ میں نے کہا..... ماموں جی آپ ہی بتا دیں تو اچھا ہے۔ بے اختیار ہنس پڑے۔ پھر اپنے کسی استاد صاحب کا نام لے کر کہنے لگے کہ انہوں نے ہمیں سکھائی تھی۔ اور پھر یہ نیت بتائی

"قصدت التراب لحصول الطهاره واباحته الصلوٰة"

یہ تھی ان کی علمی نافعیت جس سے انکی صحبت میں بیٹھنے والے ہر لمحہ مستفید ہوتے۔

شرعی معاملات بالخصوص فرائض دین میں کوتاہی اور زندگی گزارنے کے انداز میں غیر مسلم اقوام کی نقالی انہیں سخت ناگوار گزرتی کیونکہ ان کا معیار اور منتہا و مقصود صرف اور صرف اسوۂ رسول اور عمل صحابہ تھا جو اس کے سوا تھا، وہ انہیں کسی طور پر بھی پسند نہ تھا۔ نماز اور قرآن کے معاملے میں، میں نے انہیں ہمیشہ حساس پایا اور اس سلسلے میں وہ اپنے رب کے اس حکم پر عمل پیرا تھے..... وامرا هلک بالصلوه واصطبر علیها (اور حکم دو اپنے گھر والوں کو نماز کا اور خود بھی اس پر قائم رہو) بارہا ایسا ہوتا کہ ہم بہنیں، امی اور ممانی جان وغیرہ باتوں میں مصروف ہوتیں، اسی دوران نماز کا وقت ہو جاتا تو فوراً آواز دیتے "بھئی نماز کا وقت ہو گیا ہے نماز پڑھ لو" اور کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ ہم ان سے ملنے جاتے اور نماز کا وقت ہوتا تو سلام دعا کے فوراً بعد پوچھتے نماز پڑھی ہے یا پڑھ آئے ہو؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو کہتے، پہلے پڑھ لو پھر باتیں کرینگے۔ اسی طرح قرآن کے بارے میں بھی ضرور پوچھتے کہ کتنی منزل روزانہ پڑھتی ہو، اور پھر کہتے کہ قرآن یاد کرنے کا اس سے آسان طریقہ اور کوئی نہیں کہ روزانہ ہر نماز میں ایک پاؤ پڑھا جائے، اور یہ خود ان کا زندگی بھر کا معمول تھا۔

ماموں جی کو اللہ نے علم و عمل کے ساتھ قوت حافظہ اور یادداشت کی دولت سے بھی ناقابل یقین حد تک نوازا تھا۔ کبھی ہم میں سے کسی کو کوئی کتاب اٹھا کر لانے کا کہتے تو صرف کتاب کا نام ہی نہیں بلکہ

مصنف کا نام، جلد کا رنگ اور الماری کے کس خانے میں کس لائن میں پڑی ہے، یہ تک بتاتے۔ اور ایسا شاذو نادر ہوا کہ کتاب اس جگہ سے نہ ملی ہو۔ دیانت و امانت ان کا نمایاں وصف تھا، بالخصوص جماعت کے پیسیوں کی ایک ایک پائی کا حساب رکھتے اور لکھتے۔ زکوٰۃ، صدقہ، ہدیہ،..... ہر مَد پر الگ الگ نام لکھ کر رکھتے اور کئی بار ایسا ہوا کہ حساب کرتے ہوئے گنتی میں کہیں غلطی رہ جاتی اور انہیں حساب صحیح محسوس نہ ہوتا تو ان کا چہرہ ایک دم متغیر ہو جاتا۔ پھر دوبارہ حساب کرنے پر جب درست نکلتا تو ایک اطمینان سا چہرے پر پھیل جاتا۔

بیماری کے آخری دو سالوں میں ان پر بہت رقت طاری ہو گئی تھی۔ ہم بہنیں اور امی جب بھی ملنے جاتیں تو امی سے مل کر آبدیدہ ہو جاتے۔ باتوں کے دوران اگر اماں جی، نانا ابا جی یا کسی اور بزرگ کا تذکرہ ہو جاتا تو پھر ضبط کرنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا۔

فالج، شوگر اور اس کے ساتھ دوسری مختلف بیماریوں نے انہیں رفتہ رفتہ چارپائی تک محدود کر دیا۔ جوں جوں قوت مدافعت کم ہوتی گئی، نقل و حرکت میں بھی دقت ہونے لگی اور فالج کا اثر زبان پر نمایاں ہونے لگا۔ بات بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی۔ مسلسل لیٹے رہنے کی وجہ سے کمر پر زخم (BED SORE) ہو گئے۔ ہاتھوں کی گرفت باقی نہ رہی۔ لیکن ان کے سب کے باوجود میں نے اپنے کانوں سے ان کے منہ سے ہائے یا اف کبھی نہ سنی۔ اور آخری دو تین ماہ میں ان میں ایک خاص بات جو محسوس کی گئی۔ وہ یہ تھی کہ ان میں ایک عجیب سی بے نیازی آ گئی تھی۔ پہلے ایسا ہوتا کہ اگر کوئی ملاقاتی آتا تو پردہ کروا کے اندر بلا لیتے لیکن ان دنوں ملنے سے گریز کرتے۔ خاموش لیٹے رہتے کوئی بات پوچھیں تو اشارے سے جواب دیتے۔ یوں محسوس ہوتا کہ جیسے انہیں کسی سے کوئی سروکار نہیں۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے ایک عالم کی کہی ہوئی گفتگو میں سے یہ بات یاد آ جاتی کہ سلوک کی منزلوں میں سے آخری منزل یہی ہے کہ انسان ماسوااللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

وفات سے تین دن پہلے، جمعہ کے روز صبح کے وقت امی انہیں مل کر آئیں اور عصر و مغرب کے درمیانی حصہ میں، میں اپنی سب سے چھوٹی ممانی (پیر جی ماموں کی اہلیہ) کے ساتھ انہیں ملنے گئی تو ان کی حالت دیکھ کر گنگ ہو گئی۔ دس بارہ دن میں وہ حد سے زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ میں نے قریب جا کر سلام کیا تو اشارے سے جواب دیا اور ان کی حالت کے پیشِ نظر یہ زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں سر ان کے سینے سے لگا کر پیار نہ لے سکی۔ پیر جی ماموں کا بیٹا عطاء المنان بھی ساتھ تھا، اس سے ان کو بڑا انس تھا۔ ممانی نے اسے آگے کرتے ہوئے کہا کہ تایا ابو سے پیار لو۔ انہوں نے بھی ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی لیکن شدید نقاہت کے باعث ایسا نہ کر سکے تو میرا دل کٹ کر رہ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید اب ہم میں سے کسی کو بھی کبھی ان ہاتھوں کا لمس نصیب نہ ہو، اور اس سے آگے سوچنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں جتنی دیر بیٹھی رہی، انہیں مسلسل دیکھتی رہی۔ جی چاہتا تھا کہ ضبط کے سارے بندھن توڑ دوں لیکن ان کی حالت اور ممانی جان کی پریشانی

کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے سارے آنسو اپنے اندر ہی اتار لیے۔ ان کے چہرے کی ساری سرخی کہیں غائب ہو گئی اور ہر طرف زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی پہلا ہی موقع تھا، ورنہ وہ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ شدید بیماری کی لپیٹ میں آئے اور ہسپتال تک جانے کی نوبت آئی لیکن ان کے چہرے کی سرخی، تازگی، بشاشت اور رونق میں کوئی فرق نہ آیا۔ چہرے سے کوئی بھی انکی بیماری کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس روز تو معاملہ ہی الٹ تھا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ ان کے منہ سے بے اختیار ایک مرتبہ ہائے کا لفظ سنا۔ لگتا تھا کہ تکلیف اپنی انتہا پر ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد انہیں سلام کر کے بوجھل دل کے ساتھ میں گھر واپس آ گئی۔ آتے ہی میں نے امی سے دو تین مرتبہ کہا کہ آپ نے ماموں جی کو دیکھا ہے؟ ان کی کیا حالت ہو گئی ہے؟ تو انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا ہاں دیکھا ہے، اور اس سے آگے کچھ کہنے کی شاید ان میں بھی ہمت نہ تھی۔ اس روز سے ایک پل کیلئے بھی ماموں جی میری نظروں سے اوجھل نہ ہوئے۔ تئیس اکتوبر بروز پیر جبکہ غروب آفتاب میں ابھی چند لمحے باقی تھے، معاویہ بھائی نے ذوالکفل بھائی کو ٹیلی فون پر کہا کہ ابی کی طبیعت کچھ خراب ہے، پھوپھو جان! اگر آ جائیں تو اچھا ہے۔ امی نے نماز مغرب ادا کی اور دل گرفتہ سی چلی گئیں اس کے بعد آنے والا ہر ہر لمحہ اور ایک ایک پل بھاری تھا۔ کس کس طریقے سے اپنے رب کے حضور فریاد نہیں کی لیکن وقت موعود کے سامنے ہر دعا بے بس ہو جاتی ہے۔ تقریباً آٹھ بجے کے قریب کفیل بھائی جان نے آ کر بتایا کہ انہیں سیال کلینک میں داخل کروا دیا گیا ہے۔ میں نے بے اختیار پوچھا، ان کی طبیعت کیسی ہے تو بھائی جان جواباً ایک جملہ کہا..... "لگتا ہے ماموں جی نے تیاری کر لی ہے" رات پونے گیارہ کے قریب چند لمحوں کیلئے میری آنکھیں بند ہوئیں تو ذوالکفل بھائی نے میرے سرہانے کھڑے ہو کر گلوگیر لہجے میں صرف یہ چار لفظ کہے۔ "ماموں جی چلے گئے"۔ اور پھر اس کے بعد ضبط کا کس کو یارا تھا۔ جیسے کیسے رات گزر گئی کہ اسے تو بہر حال گزرنا تھا۔ صبح کو جب ہم لوگ ان کے ہاں پہنچے تو انہیں غسل دیا جا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جب ان کی چارپائی اندر کمرے میں لا کر رکھی گئی تو یہ وہی جگہ تھی جہاں ٹھیک چار دن پہلے میری ان سے زندگی کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ ہاں اتنا فرق ضرور تھا اس روز انہوں نے صرف سفید کرتا پہنا ہوا تھا اور آج پورا لباس سفید تھا۔ اس روز چہرے پر تکلیف اور کرب کے آثار تھے لیکن آج طمانیت و آسودگی اور راحت و سکون کی انتہاء تھی۔ بخدا میں نے ایسی چمک اس سے پہلے ان کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی..... میں حیرت زدہ سی ایک ٹک انہیں تکے جا رہی تھی، اور شاید میری یہ حیرت ہمیشہ برقرار رہتی اگر مجھے قرآن کریم کی یہ آیت یاد نہ آ گئی ہوتی۔

واماالذین ابیضت وجوھھم ففی رحمتہ اللہ (اور جن کے چہرے سفید ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے)

کتنی عجیب بات ہے کہ ان کی زندگی میں نے ان کے کئی کام کیے لیکن ان کا کوئی کپڑا کبھی نہیں سیا۔ لیکن جو لباس پہن کر وہ اللہ کے حضور روانہ ہوئے وہ میرے ہی ہاتھوں تراشا گیا۔ میرے لیے یہ ایک سعادت سے کم نہیں۔

ماموں جی کے انتقال پر گھر میں اور جنازہ پر لوگوں کی آمد، ان کی محبت کے انداز اور غم کی کیفیت کو

دیکھ اور سن کر مجھے ایک حدیث یاد آ گئی۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو اھل آسماں میں منادی کی جاتی ہے کہ اللہ فلاں سے محبت کرتے ہیں، اس سے محبت کرو، چنانچہ تمام اھل آسماں اس شخص سے محبت کرتے ہیں ثم یوضع لہ القبول فی الارض (اور پھر اس کے لیے زمین میں مقبولیت پیدا کر دی جاتی ہے) اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے انہیں کتنی مقبولیت عطاء کی اور لوگوں کے دلوں میں کس طرح ان کی محبت ڈالی، اس ضمن میں ایک واقعہ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ جماعت کے رکن اور ماموں جی کے بہت قریبی ساتھی حافظ محکم الدین رحمتہ اللہ علیہ (ساکن بستی شہلی غربی تحصیل حاصل پور ضلع بہاولپور) کی اہلیہ جب تعزیت کیلئے آئیں تو بتانے لگیں کہ صبح کی نماز کے بعد مجھے سپیکر پر اپنے بیٹے کی اتنی آواز سنائی دی "ہمارے شاہ جی" اور پھر خاموشی! تین دفعہ ایسا ہوا آخر چوتھی دفعہ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "ہمارے شاہ جی کا انتقال ہو گیا" اور پھر وہ بے اختیار روتے ہوئے کہنے لگیں کہ آپ یقین کریں، ہماری پوری بستی میں اس دن کسی نے چولہا نہیں جلایا" مجھے ان کی باتیں سنتے ہوئے حضور ﷺ کا یہ قول یاد آیا..... من تواضع للہ رفعہ اللہ، (جس نے اللہ کے لئے عاجزی اختیار کی اللہ اسے بلند کریں گے) بلاشبہ اللہ نے انہیں بے مثال رفعتوں سے نوازا۔

ماموں جی کی باتیں اور یادیں چراغ راہ ہیں۔ راہ حق پر چلنے کیلئے ہمت و حوصلہ اور عزم و پختگی کا سامان ہیں۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ انہوں نے اپنے کردار، عمل، علم، استقلال، عزم و ہمت سے ہمیں بہت کچھ سکھایا اور سمجھایا ہے۔ دین کے حوالے سے ان کا دامن کتنا اجلا اور کتنا شفاف ہے۔ سچ کہنے کی پاداش میں ہر دکھ اور مصیبت کو قبول کیا لیکن کسی سے کوئی سمجھوتہ، کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ وہ اگر صرف خلیفہ عادل و راشد سیدنا امیر معاویہ (سلام اللہ ورضوانہ علیہ) کے حوالے سے ہی کسی ترابی، کسی اجتہادی، کسی نقوی، کسی آیت اللہ اور کسی روح اللہ سے سمجھوتہ کر لیتے تو ان کی راہ کا ہر کانٹا پھول بن جاتا لیکن انہوں نے حق کہنے، اس پر ڈٹ جانے اور اس کے نتائج کو خندہ پیشانی سے قبول کرنے کو ہی زندگی کا مقصد جانا اور اس سلسلے میں قرآن کے اس حکم "لا یخافون لومتہ لائم" (وہ اللہ کے بارے میں..... کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے) کو حرز جاں بنایا۔

ہمارے عقائد، خیالات و افکار اور نظریات کی درستی بلاشبہ انہی کی مرہون منت ہے۔ وہ ہمارا ایک مضبوط اور قابل فخر حوالہ ہیں۔ وہ ہماری پہچان اور شناخت ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان سے جب بھی دعا کی درخواست کی، جواباً ہمیشہ ایک ہی جملہ کہا..... میں سب کیلئے دعا مانگتا ہوں اور نام لے لے کر مانگتا ہوں۔ تو گویا وہ ہمارے بن کہے ہی، اپنے رب سے نہ جانے ہمارے لیے کیا کچھ مانگتے تھے۔ آہ، کہ اب ہم اپنے لیے بارگاہ ایزدی میں اٹھنے والے ان ہاتھوں اور تڑپنے والے دل سے ہمیشہ کیلئے محروم ہو گئے۔ لیکن ماموں جی، ہم اب بھی قدم قدم پر آپکی روحانی توجہ کے طلبگار اور مستحق ہیں۔ آپ پر خدا کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں۔

ان کے مرقد پہ نور کی بارش
میرے مالک سدا ہی برسانا